DIGITAL RIGHTS & FEMINIST FUTURES

BY ZUHA SIDDIQUI
AND AZIZA AHMAD

Proofreader: Gary Crabb

Urdu Translation by Aqeel Ahmad Yousafzai

Entire contents © Copyright, 2021 by Zuha Siddiqui and Aziza Ahmad. All rights reserved. No part of this comic may be reproduced in any form without written permission from Zuha Siddiqui and Aziza Ahmad and Goethe-Institut Indonesien.

Digital Rights and Feminist Futures of Zuha Siddiqui and Aziza Ahmad was developed as part of Movements and Moments – Feminists Generations, an initiative of Goethe-Institut. The project aims to make visible Indigenous feminist activisms and protagonists from the Global South by relating their life stories in the highly accessible format of comics.

خواتین کے عالمی دن کے موقع پر جب پاکستانی خواتین اپنے حقوق کے لیے باہر نکلتی ہیں، تو جوش اور ولولے کی ایک فضا قائم ہوتی ہے ۔

تاہم اس سے منسلک خوشی کا احساس زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوتا۔

کیونکہ جلد ہی اس کے خلاف انٹرنیٹ پر نفرت انگیزی شروع ہوجاتی ہے۔

اس فوری ردعمل کے دوران، انٹرنیٹ پر نگہت داد کی موجودگی ہمیں آن لائن ہراسگی کے تقریباً ہر کیس میں ایک مزاحمتی قوت کی صورت میں نظر آتی ہیں۔

نگہت ایک وکیل ، ڈیجیٹل حقوق کی ایک سرگرم کارکن اور ڈیجیٹل رائٹس فاؤنڈیشن کی بانی ہیں جو کہ ایک تحریکی تنظیم ہے جس نے آن لائن ہراسگی کے خلاف پاکستان کی پہلی ہیلپ لائن شروع کی۔

اور وہ جانتی ہیں، جعلی تصویروں اور نفرت انگیز ٹویٹس میں سر عام گھسیٹی جانے والی ہر عورت کی طرح

کہ خواتین کے خلاف سائبر تشدد بھی نہ ختم ہونے والا ہے۔

پاکستان میں، جنوری 2021 میں انٹرنیٹ کے 6 اعشاریہ 134 کروڑ صارفین تھے۔

لیکن انٹرنیٹ تک رسائی کے کچھ نتائج بھی ہوتے ہیں، خصوصاً خواتین کے لیے۔بالکل ویسے ہی، جس طرح عام زندگی میں خواتین کو پورا سال، ہر دن، 24 گھنٹے تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اسی لیے ، نگہت نے اپنے لیے کوئی دفتری اوقات متعین نہیں کیے۔

یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کی چالیس سالہ زندگی میں، نگہت نے اپنے خاندان، اپنے ساتھ کام کرنے والوں ، اور اپنے دفتر کی مخالفت کا ثابت قدمی سے سامنا کیا ہے۔ اور اس نے نظامِ قانون کی کوتاہیوں اور ناکامیوں کو براہ راست دیکھا ہے، نہ صرف ایک وکیل کی حیثیت سے، بلکہ اپنے بچے کی حضانت کے لیے لڑنے والی ایک اکیلی ماں کی حیثیت سے بھی۔

میں، بالکل 2007
تنہا، وہ خود کو
شکست خوردہ اور
ٹوٹا ہو اپاتی تھی۔

عدالت کے کمرہ ہالوں میں،
نگہت نے اپنی جیسی بہت
سی شکست خوردہ نظر
آنے والی عورتوں کو دیکھا۔

جب وہ چلتی تھیں ، تو وہ ہمیشہ
کسی مرد کے ساتھ ہوتیں ، کبھی باپ،
کبھی بھائی کے ساتھ۔۔۔ مگر اکیلی
کبھی نہیں۔ اور ان کی نظریں ہمیشہ
فرش پر گڑی ہوتی ہوتی تھیں

وہ سب شرمند
ہوتی تھیں۔

رکو! یہ میرا بچہ ہے!
کیا کرہے ہو؟

ہمیں اس کو اس
کے باپ کے پاس لے
جانا ہے۔

اس کا باپ سے
ملنا ضروری ہے۔

MAMA!

MAMA!

نگہت خاموشی سے
عدالت کو دیکھتی رہی -
ایک محترم ادارہ جس کا
مقصد غیر جانبداری،
انصاف اور سب کے لیے
مساوات کا قیام تھا- وہی
عدالت ماؤں نے ان کے
بچے جدا کررہی تھی۔

اور نگہت دیکھتی رہی جب
عورتوں کو خاموش کرایا گیا۔
آواز نیچی کریں بی بی!
ہنگامہ کیوں بنا رہی ہیں؟
مجھے۔۔۔ مجھے
حق ہے۔۔۔
یہ عورتیں، غصے سے
بپھری کتیاں
اور مردوں کو داد دی جاتی تھی۔
بہت عمدہ ، جناب۔
خوب دلیل دی ہے!
اور جب نگہت نے کالا کوٹ پہن کر، ایک وکیل کی حیثیت
سے اپنے دفاع میں آواز اٹھائی تو جج نے اس کو گھورتے
ہوئے خاموش ہونے کا کہا۔
بحث بند کریں،
بی بی
خاموشی سے، نگہت بھڑک
اٹھی۔ اس کے اندر ایک آگ
روشن ہوگئی۔

عدالت میں، اپنے بچے کی حضانت کے لیے نگہت کی توانائی قابلِ دید تھی۔ اس نے ایسی طاقت کا مظاہرہ کیا جس کے ہونے کا اسے خود بھی پتہ نہیں تھا۔

لیکن دفتر میں، اس کے پر کاٹ دیئے گئے تھے۔

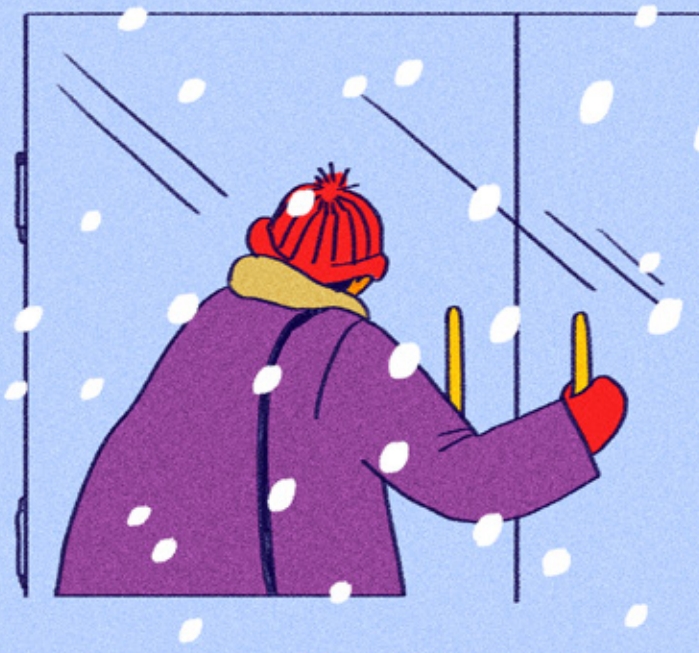

وہ دفتر سب سے پہلے صبح 07 بجے پہنچتی تھی۔ صبح دفتر کھولنا اس کی ذمہ داری ہوتی تھی - بارش ہو، آندھی ہو یا طوفان ، یہ اس کی ذمہ داری تھی۔

اتنے مردوں کی لا فرم میں واحد عورت کے طور پر ، اس کو ایک طرف بیٹھنے کا کہا گیا تھا جبکہ مرد وں کے لیے کیسوں کے انبار لگے ہوتے تھے۔

اس وقت، اس کی طلاق کے فوراً بعد ، وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ ان کے پاس ایک ہی گاڑی تھی، جو کہ گھر کے کئی افراد استعمال کرتے تھے۔

لاہور کی دھند بھری سردیوں میں، وہ سورج نکلنے سے پہلے گھر سے نکل پڑتی تھی، دو بسیں بدل کر اور آدھا میل چل کر دفتر پہنچتی تھی۔

نگہت کے بھائی اس کے فیصلوں کے وجہ سے اس سے جھگڑتے تھے۔
یہ کرتی ہی کیوں ہو؟ کیوں کام کرتی ہو؟ اس کے بھائی پوچھتے تھے۔ مشکل سے آٹھ ہزار روپے کماتی ہو اور وہ بھی تمھارے آنے جانے میں لگ جاتے ہیں۔ اپنے بچے کے ڈائپر تک تو خرید نہیں سکتیں۔
لیکن نگہت کے والد اس کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ اس کی قوت کا سرچشمہ تھے۔
خاص طور پر اس کی طلاق کے بعد۔
میں بس آپ کی بیٹی کی طلاق پر تعزیت کرنا چاہتی تھی۔ بہت ہی افسوس ناک بات ہے۔
نگہت، ان کی مت سنو۔ تم کام پر جاؤ۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور دوبارہ کبھی کسی پر منحصر مت ہونا۔

نگہت داد کی زندگی بہت زاویوں سے اس کے باپ مہراللہ داد سے ملتی جلتی تھی۔

نگہت کی طرح وہ بھی ایک غریب گھرانے سے تھے، اور نگہت ہی کی طرح، ان کے بھی خواب بڑے تھے۔

مہر اللہ داد اور ان کی بیوی نسرین، پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں رتہ مٹہ میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے آبا و اجداد کی طرح کاشتکار تھے۔

فصل کے ایک چھوٹے حصے کے حصول کے لیے وہ تپتی دھوپ میں مہینوں کام کیا کرتے تھے۔

لیکن مہر اللہ داد کو اس نظام کا استحصال دکھائی دیتا تھا، اور وہ جانتے تھے کہ اپنے بچوں کی بہتر زندگی کے لیے ان کو رتہ مٹہ چھوڑنا پڑے گا۔

اور پھر وہ 1960 کی دہائی میں وہاں سے
نکل پڑے اور 700 میل سفر کرکے، جنوب
میں کراچی گئے- جو کہ اس وقت1 کروڑ
لوگوں کا ایک تند رفتا ر شہرتھا۔
رتہ مٹہ
کراچی
وہاں انھوں نے مزدور کے طور پر
کام کیا، انھوں نے شہر کی بلند ترین
عمارت، حبیب بینک پلازا کےلیے
ٹرکوں سے اینٹیں اتاریں۔

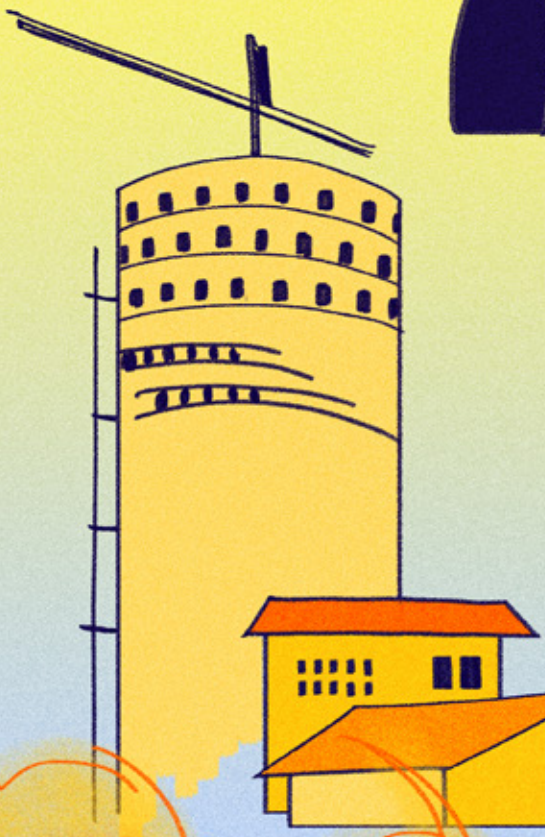

عمارت مکمل ہونے کے بعد انھوں نے
ایک مقامی خاندان کے زیر انتظام
ٹیکسٹائل کمپنی میں بطور
چوکیدار کام شروع کیا۔

مہر اللہ داد نے اگرچہ باقاعدہ تعلیم
حاصل نہیں کی تھی، لیکن وہ
حساب کتا ب میں اچھے تھے۔ ان
کے مالکوں نے جلد ہی ان کی حساب
کتاب کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا۔

مینیجر

انھوں نےاسے کلرک کی نوکری دے
دی، اور کچھ سالوں میں وہ ترقی
کرتے کرتے مینجر بن گئے۔

اورجب نگہت نے 1980 کی دہائی میں
سکول جانا شروع کیا تو اس کے والد ، جو
دو دہائیاں قبل مزدور تھے، اس کمپنی
میں حصہ دار تھے جہاں انھوں نے کلرک
کے طور پر نوکری شروع کی تھی۔

اگر چہ ان کا تعلق ابھی بھی متوسط طبقے سے تھا، ان کے حالات اس دور سے بالکل مختلف تھے جب مہر اللہ داد اور اس کے والدین مقامی زمینداروں کی کاشتکاری کرتے تھے اور کھانے پینے کے لیے ان کے رحم وکرم پر ہوتے تھے۔

ان کے سر پر چھت ان کی اپنی تھی۔

ان کے چھ بچے ، پرائیوٹ سکولوں میں انگریزی پڑھ رہے تھے اور اچھے نمبر لے رہے تھے۔

مہر اللہ داد اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرچکے تھے۔ اب ان کے خواب ان کے بچوں کے لیے تھے۔

اور آج نگہت نے اپنے والد کا خواب پورا کردیا ہے۔

وہ ملک کی معروف ترین شخصیا ت میں ایک ہیں۔

اس کیس نے سوشل میڈیا پر ایک طوفانِ آتش برپا کیا ہوا ہے اور عوامی رائے کو تقسیم کیا ہوا ہے۔

پاکستان کی ہزاروں عورتوں کی قسمت میشا شفیع کیس سے وابستہ ہے۔ اس کیس کا فیصلہ پاکستان میں ایک مثال اور نظیر کے طور پر استعمال ہوگا۔

اس کی فتح کا مطلب یہ ہوگا کہ پاکستان کے ہتک عزت کے سفاکانہ قوانین ہار گئے ہیں، جن کے خلاف نگہت پوری زندگی بر سر پیکار رہی ہیں۔

لیکن نگہت کے لیے کوئی چیز پہلی
بار کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔

وہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی
جو کالج گئی ، اور پہلی لڑکی تھی
جس نے قانون کی تعلیم حاصل کی

اس کی طلاق سے پہلے اس
کے خاندان والے اسکے خلاف یہ بات
کرتے تھے۔

2007 میں، اس کے دفتر میں جب
کوئی اس کو سنجیدہ لینے کو تیار
نہیں تھا، نگہت نے اپنے لیے ایک
کمپیوٹر بنایا۔

وہ لاہور کے ہا ل روڈ گئی۔ وہاں سے
ریم ، ہارڈ ڈرائیو اور سی پی یو کے
دوسرے حصے خریدے اور ان کو جوڑ
کر اس نے اپنا کمپیوٹر بنایا۔ پھر
350 روپے ماہانہ کے حساب سے اس
نے انٹر نیٹ کنیکشن لگوایا۔

وہ اپنی فراغت کا وقت یوٹیوب سے انگریزی سیکھنے اور ایم آئی آر سی (MIRC) کے چیٹ رومز میں اپنی انگریزی کی پریکٹس کرنے میں گزارتی۔

ساتھ ہی لاہو رمیں اپنی زندگی کی یک رنگی توڑنے کے لیے اس نے مختلف فیلو شپس کے لیے درخواستیں جمع کیں۔

2009 میں، اس کو امریکی سفارت خانے سے ایک کال موصول ہوئی جس میں اسے بتا یا گیا کہ انٹرنیشنل ویزیٹر لیڈرشپ پروگرام (آئی وی ایل پی) کے لیے اس کا انتخاب ہوگیا ہے۔ نگہت کو لگا کہ کوئی اس کے ساتھ دھوکا کررہا ہے۔

جب وہ گھر آئی اور اس نے اپنے گھر والوں کو اس کے بارے میں بتایا تو اس کے بھائی کو لگا کہ وہ ان کو جھانسا دے کر ملک سے نکلنا چاہتی ہے۔

مجھے کوئی اس کے لیے کیوں منتخب کرے گا۔

میں تو کوئی ہوں بھی نہیں۔

تم ہمیں کس جرم کی سزا دے رہی ہو

امریکہ کا وہ سفر نگہت کا جہاز کا پہلا سفر
تھا، اور وہ پہلی دفعہ ملک سے باہر نکلی تھی۔

امریکہ میں، اس کی یوٹیوب سے سیکھی ہوئی انگریزی بالآخر اس کے کام آئی۔

بعد میں رات کو

ہائے بیٹا! تمھیں یقین نہیں آئے گا کہ آج میں کتنا بولی ہوں۔ میرا چہرا دکھ رہا ہے۔۔۔ سکول کیسا جارہا ہے؟

لاہور واپس آنے کے ایک مہینے بعد، نگہت کو احساس ہو کہ اس سفر نے اس کی زندگی بدل دی ہے۔

دنیا اس کمرے سے کئی گنا زیادہ بڑی ہے۔ کرنے کو اتنا زیادہ کام ہے۔ مجھے یہ نوکری چھوڑنی چاہیے۔

اس کے بعد کے مہینوں میں، نگہت نے خود کو
تعلیم دی: اس نے سیکھی ہوئی چیزوں کو
بھلایا،اور پھر چیزیں سیکھیں، اور مزید
سیکھیں۔ اس کو معلوم ہو ا کہ پاکستان میں

سائبر جرائم کے لیے کوئی
قانون ہی نہیں ہے۔

اس کو قومی سلامتی، مذہب،
اوراخلاقیات کے نام پر آن لائن
فورمز کے بلاک کیے جانے

اور آزادی اظہار رائے پر
قدغنوں کا بھی پتہ چلا۔

تین سال بعد، اکتوبر 2012 میں اس نے ڈیجیٹل رائٹس
فاونڈیشن (DRF) کی شروعات کیں، ایک بلا منافع تنظیم
جس کا کام خواتین کو اس قابل بنانا تھا کہ وہ کرناتھا،
اورانٹرنیٹ سب کے لیے محفوظ بنانا تھا۔

خواتین کو اس قابل بنانا
تھا کہ وہ سائبر ہراسگی
کا مقابلہ کرسکیں

پرائیویسی کے مضبوط
قانونی تحفظ کے لیے
کوشش کرناتھا

اور انٹرنیٹ سب کے
لیے محفوظ بنانا تھا

آج ڈی آر ایف (DRF) ایسی صورتوں میں تحفظ کا وسیلہ ہے جہاں
قانون نافذ کرنے والے ادارے انصاف فراہم کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔

پچھلے موسم گرما میں لاہور کی ایک یونیورسٹی
نے خود کو اپنے#می ٹو تحریک کے بیچ میں پا یا۔

ایک شاندار ، قوت انگیزصورتحال ایک
خوفناک شکل اختیار کر چکی تھی۔

وہ ایک نہ ختم ہونے والی، بے خوابی کی رات تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

جس نے بھی آواز اٹھائی تھی اپنی پوسٹس مٹانے کی جلدی میں تھا، کیونکہ سب کو طاقتور مردوں سے ہتک عزت کے نوٹسز ملنے کا خوف تھا۔

مرہا، 22
یونیورسٹی کی نسوانی حقوق کی حامی تنظیم کی صدر

جو خواتین سڑکوں یا انٹرنیٹ پر احتجاج کرتی ہیں، انھیں اسی انٹرنیٹ ہراسگی کے قانون کے تحت نشانہ بنایا جاتا ہے جو ان کے تحفظ کے لیے بنایا گیا تھا- دی پریوینشن آف الیکڑانک کرائمز ایکٹ، یا (پیکا) ۔

LOADING...

اس کے نتیجے میں پاکستانی خواتین نے قانون نافذ کرنے والے اداروں بالخصوص فیڈرل انوسٹی گیشن ایجنسی (ایف آئی اے) جو کہ 2007 سے سائبر جرائم کی تفتیش پر مامور ہے، پر اپنا اعتماد کھو دیا ہے۔

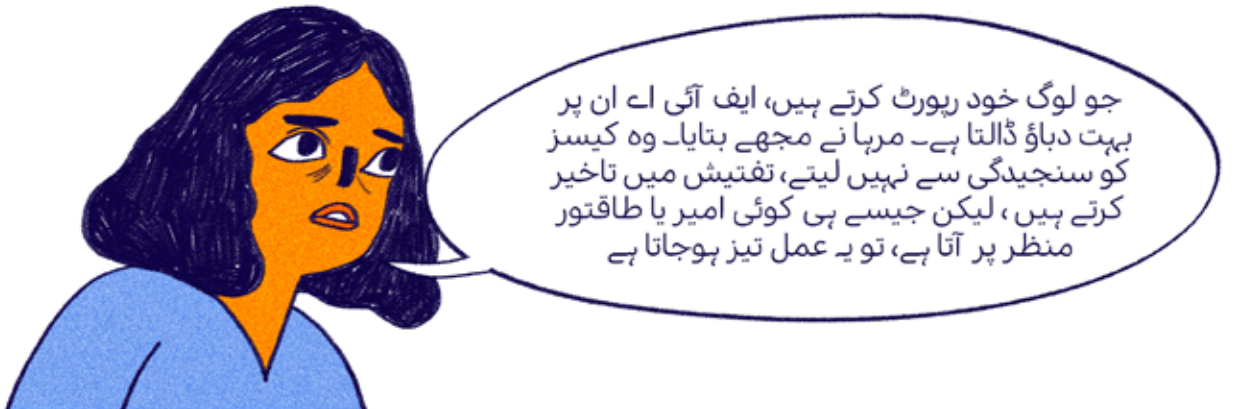

جو لوگ خود رپورٹ کرتے ہیں، ایف آئی اے ان پر بہت دباؤ ڈالتا ہے۔ مرہا نے مجھے بتایا۔ وہ کیسز کو سنجیدگی سے نہیں لیتے، تفتیش میں تاخیر کرتے ہیں، لیکن جیسے ہی کوئی امیر یا طاقتور منظر پر آتا ہے، تو یہ عمل تیز ہوجاتا ہے

جہاں قانون نافذ کرنے والے ناکام ہوجاتے ہیں، وہاں ڈی آر ایف اپنا کردار ادا کرتی ہے ۔ لیکن پانچ سال پہلے جب قندیل بلوچ کا قتل ہوا، اس وقت ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا۔

ایک 26 سالہ سوشل میڈیا سٹار، قندیل نے اپنی لجانے والی ویڈیوز اور تصویروں سے پاکستانی عوام کی دکھتی رگ چھیڑ دی تھی، اگر چہ یہ زیادہ تر دھیمی نوعیت کی تھیں لیکن پاکستان میں بہت سے لوگوں کو اشتعال انگیز لگیں۔

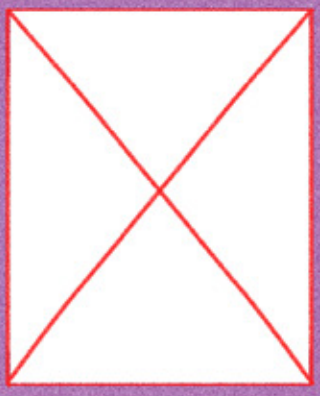

جولائی 2016 میں اس کے بھائی نے بے دردی سے اسے قتل کردیا۔

اس کی موت سے تین ہفتے قبل، قندیل کی شناخت کے دستاویزات ٹویٹر پر لیک کیے گئے تھے۔

اس کو معلوم تھا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے ۔ اس نے مقامی پولیس اور فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی سے سیکورٹی فراہم کرنے کی درخواست کی۔

انھوں نے تحفظ نہ دیا۔

قندیل کی موت نے مجھے دہلا دیا۔ اس کے بعد میں نے خود کو ٹوٹا ہوا پایا۔

اس کی موت کے بعد، مجھے معلوم تھا کہ عورتوں کے لیے سائبر ہراسگی ہیلپ لائن کا قیام ضروری تھا۔ لیکن میرے پاس پیسے نہیں تھے، اور کوئی بھی مدد کرنے کو تیار نہ تھا۔ امداد کرنے والے ادارے بھی ہچکچا رہے تھے۔

اس نوعیت کی سائبر ہراسگی کی ہیلپ لائن پہلے جنوبی ایشیا میں کبھی قائم نہیں کی گئی۔

تم اس کو کس طرح جاری رکھو گی؟

اسی موسم گرما میں، اس کی دوست نے اس کو ڈچ ہیومن رائٹس ٹیولپ ایوارڈ کے لیے نامزد کیا۔

ستمبر تک، اس کو ٹیولپ ایوارڈ کی شارٹ لسٹ میں شامل کر دیاگیا تھا، اور دو ماہ کی ووٹنگ کے بعد، نومبر 2016 میں۔۔۔

تازہ ترین خبریں

نگہت داد نے 2016 کا ڈچ ہیومن رائٹس ایوارڈ واصول کیا ہے۔

یکم دسمبر 2016 کو، ہیلپ لائن نے اپنی پہلی کال موصول کی۔

دو افراد،نگہت داد اور ان کی ساتھی شمائلہ خان پر مبنی ،ا س ٹیم
کی سائبر ہراسگی کی ہیلپ لائن بہت تیزی سے بڑھی ہ ے اور اب
مہینے میں اوسطاً 212 کالز موصول کرتی ہے۔

وہ آن لائن ہراسگی سے متاثرہ افراد کی نفسیاتی کونسلنگ
کرتی ہیں، اور ایک مختص لیگل آفیسر کے ذریعے قانونی
معاونت بھی فراہم کرتی ہیں۔

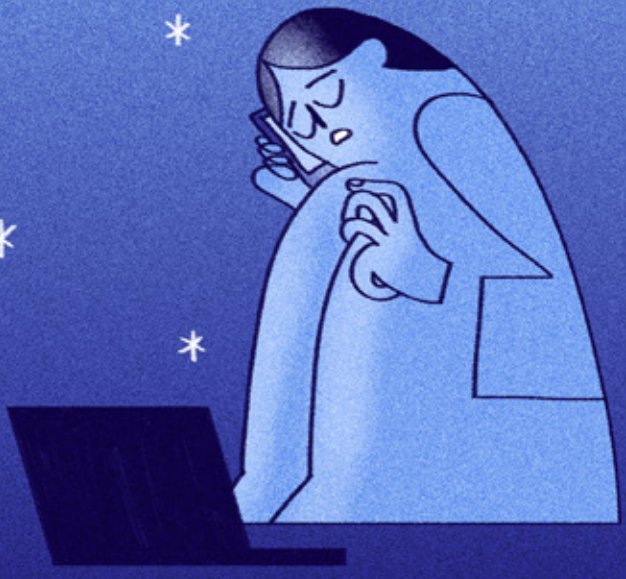

جب 2020 میں پاکستان میں عالمی وبا پھیلی
اور خواتین 24 گھنٹے اپنے گھروں میں محصور
ہوگئیں، تو ہیلپ لائن ہفتے کے ساتوں دن، 24
گھنٹے کام کرنے لگی۔اور موصول ہونے والی
کالز کی تعداد بدستور بڑھتی رہی۔

اپنی زندگی کے چالیس سال گزارنے کے بعد،
نگہت داد کا نام گھر گھر میں لیا جاتا ہے۔

وہ ملک بھر میں سفر کرکے ان خواتین کے لیے
ٹریننگ سیشنز کررہی ہیں جو انٹرنیٹ پر
تحفظ چاہتی ہیں، جو کہ دن بدن ایک خطرناک
جگہ بنتی جارہی ہے۔

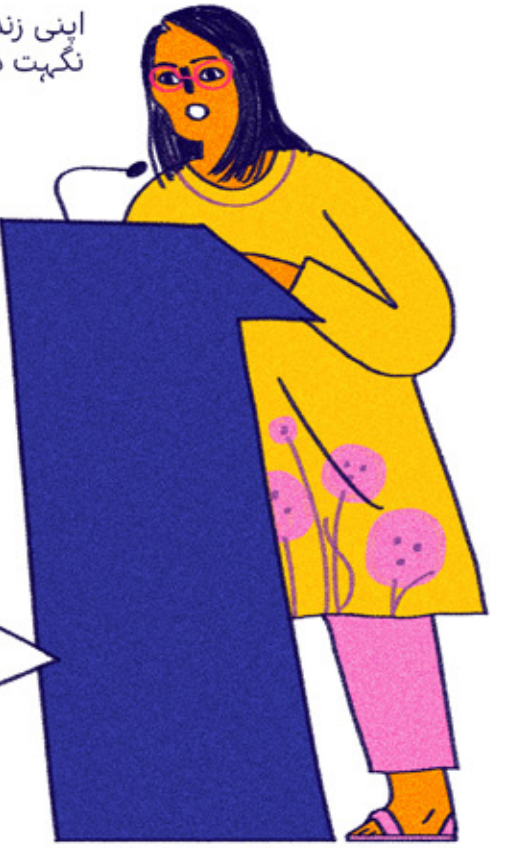

ماضی میں، اس نے شمالی پاکستان
میں، سوات کی ایک چھوٹی لڑکی
کی تربیت کی تھی جو ملک کے اس
حصے میں تعلیم کے لیے جدوجہد
میں حصہ لینا چاہتی تھی جو
طالبان کے اختیار میں تھا۔ وہ لڑکی
ملالہ یوسفزئی تھی۔

نگہت اوورسائیٹ بورڈ کی بھی رکن
ہیں، وہ بڑی ٹیکنالوجی کارپوریشنز
کا احتساب کرتی ہیں، عالمی فورمز
پر پاکستانی کی نمائندگی کرتی ہیں،
دنیا بھرمیں سفر کرتی ہیں، اور
خواتین کے لیے انٹرنیٹ کو محفوظ
بنا رہی ہیں۔

لیکن اندر سے

وہ اب بھی

وہی لڑکی ہے جو دو بسیں بدل کر، آدھا گھنٹہ چل کر دفتر جاتی تھی کیونکہ اس کے پاس رکشے کو دینے کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔

جو عدالت کے کمروں میں تنہا چلتی تھی جب وہ اپنے بچے کی حضانت کا مقدمہ لڑ رہی تھی۔

وہ ابھی بھی اسی رتہ مٹہ جھنگ کی لڑکی ہے، جو نقشے پر ایک باریک نقطے سے زیادہ نہیں ہے۔

جہاں کی لڑکیاں اب بڑے بڑے اور خوبصورت خواب دیکھتی ہیں

کہ وہ دنیا کو فتح کرسکتی ہیں، اور کریں گی۔

جب نگہت چلتی ہے، تو اپنے ساتھ سب عورتوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔

Reading List

پیکا کی بنیاد 2014 کے نیشنل ایکشن پلان ہے، جو کہ پاکستانی حکومت نے 14 دسمبر 2014 کو پشاور کے ایک ایلمنٹری سکول میں 150 طلبا اور اساتذہ کے طالبان کے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد تجویز کیا تھا۔ اس پلان کے 20 قابل عمل نکات تھے جن کا مقصد انسداد دہشت گردی تھا۔ پاکستانی حکام نے مبینہ دہشت گردوں پر نظر رکھنے، ان کا محل وقوع دیکھنے اور ان پر مقدمات کرنے کے لیے لا محدود صلاحیتوں کی ضرورت پر زور دیا۔ اِس نے سزا دینے والے ایک سائبر کرائم قانون کا راستہ ہموار کرنے اور اس کے لیے حمایت جمع کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

میں اس کے تعارف کے بعد سے، پیکا پر پاکستانی آئین میں دی گئی 2016 بنیادی آزادیوں کے ساتھ متصادم ہونے کی وجہ سے تنقید کی گئی ہے۔ اس کی سب سے زیادہ غلط استعمال ہونے والی دفعہ 20 ہے جو کہ" ہتک عزت "کو جرم قرار دیتی ہے۔اس کی تعریف یوں کی گئ ہے:" کسی معلومات کو غلط جاننے کے باوجود ان کی عام نمائش، تشہیر اور پھیلاوکا عمل جس سے کسی شخص کو دھمکایا جائے، یا اس کی ساکھ، یا پرائیوسی کو نقصان پہنچایا " جائے۔

دفعہ 11جس کا تعلق بین الامذاہب، فرقہ واری یا نسلی نفرت انگیزی سے ہے، اس کو اکثر ریاستی اداروں پر تنقید کرنے والوں کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ 2018 اور 2019 کے بیچ، کم از کم سات ایسی پولیس رپورٹس دائر کی گئیں جس میں شہریوں کو دفعہ 11کے تحت ریاستی اداروں کے خلاف "نفرت انگیزی" کے جرم میں چارج کیا گیا۔

PECA Timeline, Bolo Bhi:
https://bolobhi.org/archive-prevention-electronic-crimes-bill-2015/

DRF Annual Report:
https://digitalrightsfoundation.pk/wp-content/uploads/2021/02/Helpline-Report-2020.pdf
Pakistan's cybercrime law: Boon or Bane, Farieha Aziz for

Heinrich Böll Stiftung:
https://www.boell.de/en/2018/02/07/pakistans-cybercrime-law-boon-or-bane